کہ عورت کی دیت نصف ہے"۔

(تفسیر قرطبی ص ۳۲۵، جلد ۵ بدایۃ المجتہد ص ۴۲۵، جلد ۲

حنبلی مسلک کے مشہور امام اور مصلح ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب زاد المعاد میں لکھا ہے: وقد جاءت الشریعۃ بھذا التفضیل فی جعل الذکر کالانثیین فی الشھادۃ والمیراث والدیۃ

(ترجمہ) شریعت نے یہ بات طے کر دی ہے کہ شہادت، وراثت اور دیت میں دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوں گی۔

ملاحظہ ہو زاد المعاد جلد ۲ ص ۱۴۳، باب مُدْیَۃٌ فی الذبائح ۔ موصوف اپنی دوسری کتاب إعلام الموقّعین میں لکھتے ہیں کہ: "وقضی صلی اللہ علیہ وسلم ان عقل المرأۃ مثل عقل الرجل حتی یبلغ الثلث من دیتھا" (ذکرہ مسلم)۔ (ترجمہ) عورت کی دیت ایک تہائی تک مرد کی دیت کے برابر ہے۔ (اس سے زائد پر نصف ہوگی)۔

(اعلام الموقعین ص ۴۶ - باب: فتاوی امام المفتین جلد ۳، ۴)

دِیت کے بارے میں چند شبہات اور ان کا جواب

بعض محققین نے دیت کو قصاص کا بدل قرار دیا ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب قصاص میں مساوات ہے تو دیت میں بھی مساوات ہونی چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دیت انسانی جان کی قیمت نہیں ہے تاکہ یہ کہا جائے کہ جان اور خون تو مرد اور عورت دونوں کا یکساں ہے اور قابلِ احترام ہے، بلکہ جان تو مسلمان اور ذمی (غیر مسلم اقلیت) کی بھی یکساں طور پر واجب الاحترام ہے۔ قصاص چونکہ جان کے بدلے جان لینے کا نام ہے اس لیے عورت کی جان کے بدلے میں مرد کی جان لی جاتی ہے اور ذمی کی جان کے بدلے میں مسلمان سے بھی قصاص لیا جاتا ہے اور غلام کی جان کے بدلے میں

آزاد سے بھی قصاص لیا جاتا ہے۔ قتلِ عمد کی صورت میں تو مرد اور عورت دونوں کی وہی دیت ہوگی جس پر فریقین نے صلح کی ہو۔ کیونکہ قتل عمد کی صورت میں مقتول کے وارثوں کا اصل حق قصاص لینا ہے اور دیت اس صورت میں قصاص کا بدل ہے اور وارثوں کو معاف کرنے کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور بدلِ صلح کے عوض میں راضی نامے کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور بدلِ صلح وہی ہو سکتا ہے جس پر فریقین متفق ہوں لیکن قتلِ خطا اور قتلِ شبہ عمد میں سرے سے قصاص لینا جائز ہی نہیں ہے تاکہ یہ کہا جائے کہ دیت قصاص اور انسانی خون کا معاوضہ ہے۔ یہ تو پس ماندگان کی معاشی کفالت کا ایک قانونی اور اجتماعی نظام ہے اور اس نقصان کی کسی حد تک تلافی ہے جو خاندان کے کمانے والے یا بعد میں کمانے کے لائق بننے والے فرد کی موت سے اس کو پہنچتا ہے۔

عورت کی قوتِ کار اور کمانے کی صلاحیت چونکہ مرد کے مقابلے میں کم ہے اور جو کماتی ہیں یا بعض اوقات بعض عورتیں مردوں سے زیادہ بھی کماتی ہیں[1] تو وہ ان کا رضاکارانہ عمل ہے ورنہ ان پر معاشی کفالت کی ذمہ داری ڈالی نہیں گئی۔ اس لیے عورت کے قتل سے اس کے وارثوں کو صدمہ تو یقیناً پہنچتا ہے اور گھریلو پریشانیاں بھی لاحق ہوتی ہیں لیکن کوئی خاص معاشی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے عورت کی دیت نصف مقرر کی گئی ہے۔ جو تھوڑا بہت نقصان ہوا ہے اس کی تلافی نصف دیت سے بھی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو میراث بھی مرد کے مقابلے میں نصف دی جاتی ہے۔ فقہا کرام نے عورت کی دیت کے نصف ہونے کی یہی حکمت اور عقلی توجیہ فرمائی ہے۔ علامہ مَرْغِینانی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

[1] قانون کا تعلق عموماً اور کثیر الوقوع حالات سے ہوتا ہے، اختصاصی سے نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مقتول مرد بہت کم کمانے والا یا سرے سے بے روزگار یا معذور ہو۔ اسی طرح کوئی عورت اگر کماتی ہے اور ان میں سے کوئی بہت زیادہ بھی کماتی ہے تو قانون ایسی چند مستثنیٰ صورتوں کے نہیں ہے۔ پیش نظر تو ۹۵ فی صد عورتوں کو رکھنا چاہیے۔ (ن ر ص)

ولان حالها انقص من حال الرجل ومنفعتها اقل (ھدایۃ کتاب الدیات) (ترجمہ) یعنی عورتوں کی قوتِ کار اور اس کی منفعت مرد سے بہت کم ہے۔

علامہ سید رشید رضا مرحوم نے بھی یہی عقلی توجیہہ کی ہے۔

(تفسیر المنار ص ۳۳ ۵ جلد ۵)

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی عورت قتل کر دی جائے تو اس کی دیت (جو مرد کی دیت سے نصف ہوگی) کے حقدار اس کے ورثا ہوں گے یعنی اُس کا خاوند یا باپ اور اس کی اولاد وغیرہ۔ اس طرح نصف دیت ملنے کا نقصان عورت کو تو نہیں اس کے ورثا کو ہوگا، جن میں مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔ مرد مقتول کی دیت اگر عورت سے دوگنا ہے تو اس کا فائدہ مقتول کی بیوہ کو بھی پہنچے گا۔ اس لحاظ سے غور کیا جائے تو دیت کے مسئلے پر عورتوں کی حق تلفی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جس پر اس قدر شور مچایا جائے[1]

یہ تو ان لوگوں کی غلط بیانی یا غلط فہمی کا جواب ہے جو کہتے ہیں کہ دیت جان اور خون کی قیمت کا بدل ہے۔ حالانکہ یہ بدلیت قتل عمد میں ہے شبہ عمد اور قتل خطا میں نہیں اور عمد میں بھی دیت بدل قصاص نہیں بلکہ حقِ دیت، حق قصاص کا بدل ہے ایسا نہ مانا جائے تو لازم آئے گا کہ دیت انسانی جان کی قیمت ہے اور یہ احترامِ انسانیت کے منافی ہے۔

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں دیت کے قانون سے عورت کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا بلکہ مطلق مومن کے قتل خطاء کی دیت کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن مقام غور یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۹۲ میں سرے سے دیت کی مقدار کا تعین نہیں کیا گیا اور زیرِ بحث مسئلہ عورت کی دیت کی مقدار کا ہے۔ آخر یہ کس نے کہا ہے کہ عورت کے قتل پر دیت واجب ہی نہیں ہے؟ دیت تو ہر معصوم الدم نفس کے قتل خطا یا قتلِ شبہ عمد پر واجب ہے، خواہ

[1] شاید ماڈرن عورت اتنی گہری سوچ بچار کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ (ناشر ص)

مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا غیر مسلم شہری۔ اصل بحث عورت کی دیت کی مقدار میں ہے اور اس بارے میں قرآن میں تفصیل موجود نہیں ہے بلکہ احادیث رسول میں ہے

بعض حضرات نے عورت اور مرد کی دیت کے مساوی ہونے کے لیے اس حدیث کو دلیل بنایا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

فی النفس المومنة مائة من الابل" یعنی (نفس مومن کے بدلے میں سو اونٹ دیے جائیں گے)۔

یہ حدیث بالکل صحیح اور معروف و متداول حدیث ہے لیکن اس میں دوسری حدیث رسولؐ نے تخصیص کر دی ہے اور ایک حدیث کی تخصیص و تفسیر دوسری احادیث سے جائز ہے۔ جب دوسری حدیث اور اجماعِ صحابہ میں عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف بتائی گئی ہے تو معلوم ہوا کہ سو اونٹوں والی حدیث میں رسول اللہ کی مراد مرد کی دیت بیان کرنا تھی۔ قرآن و حدیث کا علم رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ کسی آیت یا حدیث میں صیغۂ عام یا مطلق و غیر مقید الفاظ میں کوئی قانون بیان ہوا ہے اور دوسری آیت یا احادیث نے اس میں تخصیص کر دی ہے مثلاً سورۃ النور میں زانی اور زانیہ کی سزا سو کوڑے مقرر کی گئی ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم قرآن اور اللہ کے مستند اور واجب الاطاعت نمائندے کی حیثیت سے امت کو بتا دیا ہے کہ اس آیت میں "غیر محصن" زانی مراد ہے۔

بعض حضرات نے امام طحاوی رحمۃ اللہ، ابوالولید باجی رحمۃ اللہ اور شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ یہ حضرات بھی مرد اور عورت کی مساوات کے قائل تھے حالانکہ انہوں نے المسلمون تتکافؤ دمائھم کی تشریح کرتے ہوئے اس کے مضمون کی وضاحت کی ہے اور ان کی مراد دیت کے وجوب و لزوم میں مساوات ہے۔ مقدارِ دیت میں مساوات مراد نہیں ہے اور نفسِ دیت میں برابری تو خود قرآن کی آیت سے ثابت ہے۔ آج تک کسی اہل علم نے ان کا مسلک یہ بیان نہیں کیا ہے کہ ان کے نزدیک مرد اور عورت کی دیتِ قتل مساوی ہے، نہ ہی کسی جگہ سے یہ تصریح پیش کی جا سکتی ہے کہ ان

کا مسلک یہ ہے۔ اس کے برعکس تصریحات موجود ہیں کہ ان حضرات کے نزدیک مرد اور عورت کی دیت میں مساوات نہیں بلکہ عورت کی دیت نصف ہے۔ خدا جانے کہ ان لوگوں کے اندر یا تو کلام فہمی اور کتاب فہمی کی استعداد موجود نہیں ہے یا پھر ان کو تحریفِ کلام کا تجربہ اور مہارت حاصل ہے جو حق پرستوں کی شان نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ابن علیہؒ اور الاصمؒ کے قول کو بھی اچھالا جا رہا ہے کہ یہ دونوں مقدار دیت میں مرد اور عورت کے مساوی ہونے کے قائل تھے۔

قطع نظر اس کے کہ ان حضرات کا یہ قول کسی مستند کتاب میں صحیح اسناد کے ساتھ نقل بھی نہیں ہوا۔ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے حکی غیرہما دا ے غیر ابن المنذر وابن عبدالبر کے لفظ کے ساتھ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ شاذ اور غیر منقول دغیر متداول قول ہے، جو اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اور سنتِ رسولؐ کے مخالف ہے۔ (المغنی ص ۴۰۲، جلد ۸)

صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعین اور فقہاء اسلام میں سے سوائے ابن علیہ اور الاصم کے ہمیں کافی تلاش وجستجو کے باوجود کسی کا بھی یہ قول نہیں مل سکا کہ عورت کی دیت مرد کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے چودہ صد سالہ تعامل و تواتر کے مقابلے میں اس قسم کے شاذ اقوال تلاش کرنا اور پھر ان کو دلیل بنانا مریضِ ذہن کی علامت ہے۔

پھر ذرا یہ بھی معلوم کر لیا جائے کہ ان دو حضرات کی حیثیت کیا ہے؟ تاکہ مسئلہ میں کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ ۱۔ ابو بکر اصم ۲۔ اسماعیل ابن عُلَیّہ۔ ان دو میں سے یہ اصم جس کا اصل نام عبدالرحمٰن بن کیسان ہے اس کے متعلق لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۴۲۷ میں لکھا ہے کہ وہ معتزلی تھے اور اس کا ذکر معتزلہ کے طبقات میں کیا جا رہا ہے اور اس نے جو تفسیر لکھی تھی اس کے بارے میں کہا ہے کہ تفسیر عجیب، اور اس کے شاگردوں میں اسماعیل بن علیہ کا بیٹا ابراہیم تھا جو جہمی ہے اور خلقِ قرآن کا قائل ہے۔ امام شافعیؒ نے اس کے بارے میں یہ قول لکھا ہے: "هو ضال أضلّ الناس"۔ اور اس کے اقوال اہل سنت کے ہاں متروک ہیں اور لسان المیزان میں اس کے بارے میں بہت سے اقوال ایسے منقول ہیں کہ وہ ایک بدعقیدہ شخص تھا اور غالباً اس شاگرد نے اس قسم کے اثرات اسی اصم سے

لیے تھے، اس لیے ابوبکر اصم کا کوئی قول پوری اُمت کے اجماع کے خلاف بالکل قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

۲ — شخص اسماعیل بن علیہ اگرچہ قابلِ اعتماد رواۃ حدیث میں سے ہیں لیکن اس کو فقہا مجتہدین میں شمار نہیں کیا گیا۔ البدایہ والنہایہ میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے روایت کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن علیہ کے نام سے جو یہ روایت دیت کی منقول ہے کہ وہ پوری دیت کے قائل تھے تو وہ اسماعیل بن علیہ نہیں ہوگا بلکہ اس کا بیٹا ابراہیم ہوگا۔ کیونکہ اس کو بھی ابن عُلَیّہ کہا جاتا ہے اور اس کے بارے میں لیسان المیزان کے حوالے سے ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ ایک بدعقیدہ شخص تھا اور علماء مجتہدین کے ہاں بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ ہم یہ جو کہتے ہیں کہ ابن علیہ سے مراد اسماعیل بن علیہ نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ[1] امام شافعیؒ کے استاد ہیں اور امام شافعی کتاب الام میں یوں فرماتے ہیں "کہ مجھے اہل علم میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم نہیں، نہ پہلے علماء میں سے اور نہ بعد کے علماء میں سے کہ اُس نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہو اور اگر ان کے اُستاد اسماعیل بن علیہ اس کے قائل ہوتے تو وہ ایسے جامع ترد یدی الفاظ استعمال نہ کرتے۔ خواہ ان کی ذاتی رائے نہ ہو مگر پھر بھی وہ یہ تو لکھتے کہ اسماعیل بن علیہ کا قول دوسرا ہے۔ پس اصل صورتِ حال یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین شیعہ حضرات اور زیدی وغیرہ سب کا بالاتفاق، بالاجماع فیصلہ یہ ہے کہ عورت کی دیت نصف ہے۔ اور جو لوگ اس حدیث کے راویوں پر کچھ جرح کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے تو اصولاً یہ بات بالکل غلط ہے، کیونکہ یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ جس روایت سے ائمہ مجتہدین استدلال کرتے ہیں اور حکم ثابت کرتے ہیں، بہرحال قوی قرار دیا جاتا ہے۔ کسی روایت کو ائمہ کا مدارِ استدلال بنانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ نے اس کی صحت کی توثیق کی ہے۔ اجماع کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایک روایت جو فی نفسہٖ خبرِ واحد ہونے کی حیثیت سے اصولِ حدیث کے مطابق ظنی ہوتی ہے، جب اس کے مضمون پر اجماع[2] ہو جائے تو اجماع اس

---

[1] کیونکہ دوسرے کئی عوامل وحقائق مثلاً اس کے مطابق قرونِ اولیٰ (باقی بر صفحہ آئندہ)

کو بالکل قطعی بنا دیتا ہے۔

اہلِ علم ان ساری باتوں کو جانتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ واسطہ ان لوگوں سے پڑا ہے کہ جو قرآن کی کوئی آیت صحیح تلفظ سے نہیں پڑھ سکتے، حدیث اور اصولِ حدیث، فقہ اور اُصول فقہ تو بہت دُور کی باتیں ہیں۔ مگر اس جہالت کے باوجود ان کا زعم یہ ہے کہ ہم تو امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے بڑھ کر قرآن و حدیث کو جاننے والے مجتہدین ہیں، اور آپ دیکھیں کہ خالد اسحاق صاحب کے مضمون میں اسی قسم کا اجتہاد ہے اور اس نے اس اجماع کو بھی اپنے خیال میں ناقابلِ اعتبار قرار دے دیا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کی نصف دیت کا ذکر حدیث کی معروف کتابوں میں نہیں ہے۔ یہ اعتراض اُٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو بالعموم حدیث کے علم سے کورے ہیں اور محدثین کے کام اور اُن کی اصطلاحات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہم اُوپر جو حوالے نقل کر چکے ہیں کیا وہ معروف کتبِ حدیث نہیں ہیں۔ ان میں نسائی صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہے۔ موطا امام مالک بھی اپنی روایات کے مرتبے کے لحاظ سے صحاح ستہ میں شمار کی گئی ہے۔ بلکہ یہ وہ کتاب ہے، جسے خلیفہ ابوجعفر منصور پوری اسلامی سلطنت کے قانون کے طور پر نافذ کرنا چاہتا تھا لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے مسالک کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اس کام سے روک دیا۔ بیہقی کی روایت کے بعض طرق کو اصطلاحاً ضعیف کہنے سے تمام طرق پر ضعف کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ جہاں تک نسائی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ سند و متن دونوں لحاظ سے صحیح قرار دی گئی ہے۔ امام شوکانی لکھتے ہیں، صححہ ابن خزیمۃ (یعنی مشہور ناقد حدیث

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اور دورِ خلافت میں سنتِ مسلسل کا عملاً جاری ہونا یا اصول استنباطِ احکام کے لیے نہایت جامع چار متداول فقیہوں کے ائمہ اوّلین سے لے کر آخری علماء تک اس پر متفق رہنا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی خبرِ واحد کو ظنیت کے مقام سے نکال کر حتمیت کے مقام پر لے آتی ہیں۔ (ن۔ ص)

ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے) (نیل الاوطار جلد ۷ ص ۲۲۵) - اسی طرح مصری عالم سید سابق نے بھی اپنی کتاب فقہ السنہ میں ابن خزیمہ کی تصحیح کا ذکر کیا ہے۔ (جلد ۳ ص ۴۷۶) -

اس بات کو بھی بڑے زور و شور سے اچھالا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے اور امام ابو حنیفہؒ کی بھی کچھ روایات ایسی ہیں جن میں عورت کی دیت مرد کی دیت کے ساتھ برابر ہے۔ اس کا جواب بھی ان صریح عبارات میں موجود ہے جو اس سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں، بالخصوص امام شافعیؒ کا یہ کہنا کہ میرے علم میں قدیم اہل علم میں سے کوئی بھی عورت کی دیت کی مرد کی دیت کے ساتھ برابری کا قائل نہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ اور جملہ فقہاء جو امام شافعیؒ کے دور اور ان سے پہلے کے ادوار میں گذرے ہیں، ان کے نزدیک عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔

ایک اور بات جسے وزنی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ یہ اجماع سکوتی ہے، حالانکہ ان لوگوں کو اگر اصول فقہ کا ذرہ بھی علم ہوتا تو انہیں معلوم ہوتا کہ اجماع سکوتی کو امام شافعی اجماع کا نام نہیں دیتے اور بطور حجت نہیں پیش کرتے، اور امام شافعیؒ ہی وہ شخصیت ہیں جو اجماع سکوتی کے مخالفین میں پیش پیش ہیں۔ لیکن یہاں امام شافعی عورت کی دیت پر اجماع کا ذکر کرتے ہیں، اور حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس اجماع کی حیثیت اجماعِ سکوتی کی نہیں ہے، بلکہ حقیقی اجماع کی ہے۔ پھر جب اجماعِ سکوتی کے ساتھ تعامل اُمت شامل ہو جائے تو اس کی حجیت میں کسی کو اختلاف نہیں ہوتا۔

ہم ان مدعیانِ اجتہاد سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے، بلکہ کھلا ہے۔ ظاہر ہے کہ علمی تحقیق اور غور و فکر کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اجتہاد ان جدید مسائل میں ہونا چاہیے جن کے بارے میں اجماع موجود نہ ہو اور وہ منصوص بھی نہ ہوں یا ائمہ فقہ کے درمیان اختلافی مسائل میں کسی رائے کو ترجیح دینے کا مسئلہ ہو تو اجتہاد کے ذریعے یہ کام کیا جا سکتا ہے، لیکن عورت کی دیت کا نصف ہونا تو احادیث و